Surah Nisa (Ayat 81-91)

Tadabbur Quran:

81: وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۡفَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ۭ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَي اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ○

خلاصہ تفسیر

اور یہ (منافق) لوگ (آپ کے احکام سن کر آپ کے سامنے زبان سے تو) کہتے ہیں کہ ہمارا کام (آپ کی) اطاعت کرنا ہے، پھر جب آپ کے پاس سے (اٹھ کر) باہر جاتے ہیں تو شب کے وقت (پوشیدہ) مشورے کرتے ہیں ان میں ایک جماعت (یعنی ان کے سرداروں کی جماعت) برخلاف اس کے جو کچھ زبان سے کہہ چکے تھے (اور چونکہ وہ سردار ہیں اصل مشورہ وہ کرتے ہیں باقی ان کے تابع رہتے ہیں تو اس خلاف میں سب کی ایک حالت ہے) اور اللہ تعالیٰ (سرکاری روزنامچہ میں) لکھتے جاتے ہیں جو کچھ وہ راتوں کو مشورے کیا کرتے ہیں (موقع پر سزا دیں گے) سو آپ ان کی (بیہودگی کی) طرف التفات (اور خیال) نہ کیجئے اور (نہ کچھ فکر کیجئے، بلکہ سارا قصہ) اللہ تعالیٰ کے حوالہ کیجئے اور اللہ تعالیٰ کافی کارساز ہیں، (وہ خود مناسب طور پر اس کا دفعیہ فرمائیں گے، چنانچہ کبھی ان کی شرارت سے کوئی ضرر نہیں پہنچا) کیا یہ لوگ (قرآن کا اعجاز فصاحت و بلاغت میں اور غیب کی صحیح صحیح خبریں دینے میں دیکھ رہے ہیں اور پھر) قرآن میں غور نہیں کرتے (تاکہ اس کا کلام الٰہی ہونا واضح ہو جائے) اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس (کے مضامین) میں (بوجہ ان کے کثیر ہونے کے واقعات سے اور حد اعجاز سے) بکثرت تفاوت پاتے (کیونکہ ہر ہر مضمون میں ایک ایک اختلاف و تفاوت ہوتا تو مضامین کثیرہ میں اختلافات کثیرہ ہوتے، حالانکہ ایک مضمون میں بھی اختلاف نہیں، پس لامحالہ یہ غیر اللہ کا کلام نہیں ہو سکتا)

معارف و مسائل

ویقولون اطاعت فاذا برزوا من عندک بیت طآئفۃ منھم غیر الذین تقول، اس آیت میں ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو دورخی پالیسی رکھتے ہیں، زبان سے کچھ کہتے ہیں دل میں کچھ ہوتا ہے، اس کے بعد ایسے لوگوں کے بارے میں رسول اللہ نافرمانی کے طرز عمل کے متعلق ایک خاص ہدایت ہے۔

پیشوا کے لیے ایک اہم ہدایت :۔

فاعرض عنھم وتوکل علی اللہ وکفی باللہ وکیلاًجب منافقین آپ کے سامنے آتے تو کہتے کہ ہم نے آپ کا حکم قبول کیااور جب واپس جاتے تو آپ کی نافرمانی کرنے کے لیے مشورے کرتے،اس سے رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو سخت کوفت ہوئی،اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہدایت دی کہ ان کی پروانہ کیجئے،آپ اپنا کام اللہ کے بھروسہ پر کرتے رہیں،کیونکہ وہ آپ کے لیے کافی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص لوگوں کا پیشوااور رہنما ہو اسے طرح طرح کی دشواریوں سے گذرنا پڑتا ہے،لوگ طرح طرح کے الٹے سیدھے الزامات اس کے سر ڈالیں گے دوستی کے روپ میں دشمن بھی ہوں گے،ان سب چیزوں کے باوجود اس رہنما کو عزم واستقلال کے ساتھ اللہ کے بھروسہ پر اپنے کام سے لگن ہونی چاہیے،اگر اس کارخ اور نصب العین صحیح ہوگا توانشاء اللہ ضرور کامیاب ہوگا۔

82: اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭوَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا۝

تدبر قرآن:

افلایتدبرون القرآن،اس آیت سے اللہ تعالیٰ قرآن میں غور وفکر کرنے کی دعت دیتے ہیں،اس میں چند چیزیں قابل غور ہیں،ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے افلایتدبرون فرمایا افلایقرؤن نہیں فرمایا اس سے بظاہر ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت سے یہ بات سمجھائی جارہی ہے کہ وہ اگر گہری نظر سے قرآن کو دیکھیں توان کواس کے معانی ومضامین میں کوئی اختلاف نظر نہیں آئے گااور یہ مفہوم تدبر کے عنوان سے ہی ادا ہو سکتا ہے،صرف تلاوت اور قرات جس میں تدبر اور غور وفکر نہ ہو اس سے بہت سے اختلافات نظر آنے لگتے ہیں،جو حقیقت کے خلاف ہے۔

دوسری بات اس آیت سے یہ معلوم ہوئی کہ قرآن کا مطالبہ ہے کہ ہر انسان اس کے مطالب میں غور کرے لہٰذا یہ سمجھنا کہ قرآن میں تدبر کرنا صرف اماموں اور مجتہدوں ہی کے لیے ہے صحیح نہیں ہے،البتہ تدبر اور تفکر کے درجات علم وفہم کے درجات کی طرح مختلف ہوں گے،ائمہ مجتہدین کا تفکر ایک ایک آیت سے ہزاروں مسائل نکالے گا عام علماء کا تفکران مسائل کے سمجھنے تک پہنچے گا،عوام اگر قرآن کا ترجمہ اور تفسیر اپنی زبان میں پڑھ کر تدبر کریں تواس سے اللہ تعالیٰ کی عظمت ومحبت اور آخرت کی فکر پیدا ہوگی،جو کلید کامیابی ہے،البتہ عوام کے لیے غلط فہمی اور مغالطوں سے بچنے کے لیے بہتر یہ ہے کہ کسی عالم سے قرآن کو سبقاً سبقاً پڑھیں،یہ نہ ہو سکے تو کوئی مستند ومعتبر تفسیر کا مطالعہ کریں اور جہاں کوئی شبہ پیش آئے اپنی رائے سے فیصلہ نہ کریں اور ہر علماء سے رجوع کریں۔

قرآن وسنت کی تفسیر و تشریح پر کسی جماعت یا فرد کی اجارہ داری نہیں ہے لیکن اس کے لیے شرائط ہیں :۔آیت مذکورہ سے معلوم ہوا کہ ہر شخص کو یہ حق ہے کہ وہ قرآن میں تدبر و تفکر کرے، لیکن جیسا کہ ہم نے کہا ہی کہ تدبر کے درجات متفاوت اور ہر ایک کا حکم الگ ہے مجتہدانہ تدبر جس کے ذریعہ قرآن حکیم سے دوسرے مسائل کا استخراج کیا جاتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کی مبادیات کو حاصل کرے تاکہ وہ نتائج کا استخراج صحیح کر سکے اور اگر اس نے مقدمات کو بالکل حاصل نہ کیا یا اس نے ناقص حاصل کیا، جن اوصاف و شرائط کی ایک مجتہد کو ضرورت ہوتی ہے وہ اس کے پاس نہیں ہیں تو ظاہر ہے وہ نتائج غلط نکالے گا، اب اگر علماء اس پر نکیر کریں تو حق ہے۔

اگر ایک شخص جس نے کبھی کسی میڈیکل کالج کی شکل تک نہ دیکھی ہو یہ اعتراض کرنے لگے کہ ملک میں علاج و معالجہ پر سند یافتہ ڈاکٹروں کی اجارہ داری کیوں قائم کر دی گئی ہے ؟ مجھے بھی بحیثیت ایک انسان کے یہ حق ملنا چاہیے۔

یا کوئی عقل سے کورا انسان یہ کہنے لگے کہ ملک میں نہریں، پل اور بند تعمیر کرنے کا ٹھیکہ صرف ماہر انجینئروں ہی کو کیوں دیا جاتا ہے ؟ میں بھی بحیثیت شہری کے یہ خدمت انجام دینے کا حق دار ہوں۔

یا کوئی عقل سے معذور آدمی یہ اعتراض اٹھانے لگے کہ قانون ملک کی تشریح و تعبیر پر صرف ماہرین قانون ہی کی اجارہ داری کیوں قائم کر دی گئی ہے ؟ میں بھی عاقل و بالغ ہونے کی حیثیت سے یہ کام کر سکتا ہوں، اس آدمی سے یہی کہا جاتا ہے کہ بلاشبہ بحیثیت شہری کے تمہیں ان تمام کاموں کا حق حاصل ہے، لیکن ان کاموں کی اہلیت پیدا کرنے کے لیے سالہا سال دیدہ ریزی کرنی پڑتی ہے، ماہر اساتذہ سے ان علوم و فنون کو سیکھنا پڑتا ہے، اس کے لیے ڈگریاں حاصل کرنی پڑتی ہیں، پہلے یہ زحمت تو اٹھاؤ، پھر بلاشبہ تم بھی یہ تمام خدمتیں انجام دے سکتے ہو، لیکن یہی بات اگر قرآن وسنت کی تشریح کے دقیق اور نازک کام کے لیے کہی جائے تو اس پر علماء کی اجارہ داری کے آوازے کسے جاتے ہیں ؟ کیا قرآن وسنت کی تشریح و تعبیر کرنے کے لیے کوئی اہلیت اور کوئی قابلیت درکار نہیں ؟ کیا پوری دنیا میں ایک قرآن وسنت ہی کا علم ایسا لاوارث رہ گیا ہے کہ اس کے معاملہ میں ہر شخص کو اپنی تشریح و تعبیر کرنے کا حق حاصل ہے خواہ اس نے قرآن وسنت کا علم حاصل کرنے کے لیے چند مہینے بھی خرچ نہ کیئے ہوں۔

<u>قیاس کا ثبوت :۔</u>

اس آیت سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ اگر کسی مسئلہ کی تصریح قرآن وسنت میں نہ ملے تو انہی میں غور فکر کر کے اس کا حل نکالنے کی کوشش کی جائے اور اسی عمل کو اصطلاح میں قیاس کہتے ہیں۔ (قرطبیؒ)

اختلاف کثیر کی تشریح :۔

لو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً اختلاف کثیرہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک مضمون میں اختلاف ہوتا تو مضامین کثیرہ کا اختلاف بھی کثیر ہو جاتا ہے بشر کے کلام میں یہ یکسانیت کہاں، نہ کسی جگہ فصاحت و بلاغت میں کمی، نہ توحید و کفر اور حلال و حرام کے بیان میں تناقص اور تفاوت، پھر غیب کی اطلاعات میں بھی نہ کوئی خبر ایسی ہے جو واقع کے مطابق نہ ہو، نہ نظم قرآن میں کہیں یہ فرق کہ بعض فصیح ہو اور بعض رکیک، ہر بشر کی تقریر و تحریر پر ماحول کا اثر ہوتا ہے، اطمینان کے وقت کلام اور طرح کا ہوتا ہے پریشانی کے وقت دوسری طرح کا ہے، مسرت کے وقت اور رنگ ہوتا ہے اور رنج کے وقت دوسرا، لیکن قرآن ہر قسم کے تفاوت اور تناقض سے پاک ہے، اور بالاتر ہے اور یہی کلام الٰہی ہونے کی واضح دلیل ہے۔

83: وَإِذَا جَآءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِۦ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰٓ أُولِى الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنۢبِطُونَهُۥ مِنْهُمْ ۗ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُۥ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَٰنَ إِلَّا قَلِيلًا ○

خلاصہ تفسیر

اور جب ان کو کسی امر (جدید) کی خبر پہنچتی ہے خواہ (وہ امر موجب) امن ہو یا (موجب) خوف (مثلاً کوئی لشکر مسلمانوں کا کسی جگہ جہاد کے لیے گیا، اور ان کے غالب ہونے کی خبر آئی، یہ امن کی خبر ہوئی، یا ان کے مغلوب ہونے کی خبر آئی یہ خوف کی خبر ہے) تو اس (خبر) کو فوراً مشہور کر دیتے ہیں (حالانکہ بعض اوقات وہ غلطی نکلتی ہے اور اگر صحیح بھی ہوئی تب بھی بعض اوقات اس کا مشہور کرنا مصلحت انتظامیہ کے خلاف ہوتا ہے اور اگر (بجائے خود مشہور کرنے کے) یہ لوگ اس (خبر) کو رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اور جو (حضرات اکابر صحابہ) ان میں ایسے امور کو سمجھتے ہیں ان (کی رائے) کے اوپر حوالہ رکھتے (اور خود کچھ دخل نہ دیتے) تو اس (خبر کی صحت و غلط اور قابل تشہیر ہونے نہ ہونے) کو وہ حضرات تو پہچان ہی لیتے جو ان میں اس کی تحقیق کر لیا کرتے ہیں (جیسا ہمیشہ پہچان ہی لیتے ہیں پھر جیسا یہ حضرات عمل درآمد کرتے ویسا ہی ان خبر اڑانے والوں کو کرنا چاہیے تھا، ان کو دخل دینے کی کیا ضرورت ہوئی، اور نہ دخل دیتے تو کونسا کام اٹک رہا تھا؟ آگے احکام مذکورہ سنانے کے بعد جو سر تا سر متضمن مصالح دنیویہ واخرویہ ہیں بطور منت کے مسلمانوں کو ارشاد ہے) اور اگر تم لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا (یہ خاص) فضل اور رحمت (کہ تم کو قرآن دیا اپنا پیغمبر بھیجا یہ اگر) نہ ہوتا تو تم سب کے سب) ضرر دنیوی واخروی اختیار کر کے) شیطان کے پیرو ہو جاتے بجز تھوڑے سے آدمیوں کے (جو بدولت عقل سلیم خداداد کے کہ وہ بھی ایک خاص فضل و رحمت ہے اس سے محفوظ رہتے ورنہ زیادہ تباہی ہی میں پڑتے، پس تم کو ایسے پیغمبر اور ایسے قرآن کو جن کی معرفت ایسے مصالح کے احکام آتے ہیں، برخلاف مذکورہ منافقین کے بہت غنیمت سمجھنا چاہیے اور پوری اطاعت کرنا چاہیے۔)

معارف و مسائل

شان نزول :۔

واذاجآء ھم امر من الامن اوالخوف اذاعوابہ، ابن عباس، ضحاک اور ابو معاذ (رض) کے نزدیک یہ آیت منافقین کے بارے میں نازل ہوئی اور حضرت حسن اور دوسرے اکثر حضرات کے نزدیک یہ آیت ضعیف اور کمزور مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے (روح المعانی)

علامہ ابن کثیر نے اس آیت سے متعلق واقعات نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ اس آیت کے شان نزول میں حضرت عمر بن خطاب کی حدیث کو ذکر کرنا چاہیے، وہ یہ کہ حضرت عمر (رض) کو یہ خبر پہنچی کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے تو وہ اپنے گھر سے مسجد کی طرف آئے جب دروازہ پر پہنچے تو آپ نے سنا کہ مسجد کے اندر لوگوں میں بھی یہی ذکر ہو رہا ہے، یہ دیکھ کر آپ نے کہا کہ اس خبر کی تحقیق کرنی چاہیے، چنانچہ آپ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس پہنچے اور پوچھا کہ کیا آپ نے اپنی بیویوں کو طلاق دی ہے ؟آپ نے فرمایا کہ نہیں حضرت عمر فرماتے ہیں کہ یہ تحقیق کرنے کے بعد میں مسجد کی طرف واپس آیا اور دروازہ پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کیا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی بیویوں کو طلاق نہیں دی، جو آپ لوگ کہہ رہے ہیں غلط ہے تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی : واذاجآء ھم امر الخ (تفسیر ابن کثیر)

بے تحقیق باتوں کا اڑانا گناہ اور بڑا فتنہ ہے :۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر سنی سنائی بات کو بغیر تحقیق کے بیان نہیں کرنا چاہیے، چنانچہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک حدیث میں فرمایا : کفی بالمرء کذباًان یحدث بکل ما سمع، "یعنی کسی انسان کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنی ہی بات کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات بغیر تحقیق کے بیان کر دے۔"

ایک دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا : من حدث بحدیث وھویری انہ کذب فھواحد الکاذبین۔ "یعنی جو آدمی کوئی ایسی بات بیان کرے جس کے بارے میں وہ جانتا ہے کہ یہ جھوٹی ہے تو دو جھوٹوں میں سے ایک جھوٹا وہ بھی ہے۔" (تفسیر ابن کثیر) ولو ردوہ الی الرسول والی اولی الامر منھم لعلمہ کہتے ہیں، کنواں کھودنے میں جو پانی پہلی مرتبہ نکلتا ہے اس کو ماء مستنبط کہتے ہیں، مگر یہاں مراد یہ ہے کہ کسی بات کی تہہ تک پہنچ کر اس کی صحیح حقیقت معلوم کرنا (قرطبیؒ)

اول الامر کی تعیین میں متعدد اقوال ہیں، حضرت حسن، قتادہ اور ابن ابی لیلیٰ رحمھم اللہ کے نزدیک علماء اور فقہاء مراد ہیں، حضرت سدی (رح) فرماتے ہیں کہ امراء اور حکام مراد ہیں، ابو بکر جصاص ان دونوں اقوال کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ دونوں مراد ہیں، اس

لیے کہ اولی الامر کا اطلاق ان سب پر ہوتا ہے، البتہ اس پر بعض لوگ یہ شبہ کرتے ہیں کہ اولی الامر سے مراد فقہاء نہیں ہو سکتے، کیونکہ اولی الامر اپنے لفظی معنی کے اعتبار سے وہ لوگ ہیں جن کا حکم چلتا ہو اور ظاہر ہے کہ فقہاء کا یہ کام نہیں حقیقت یہ ہے کہ حکم چلنے کی دو صورتیں ہیں ایک جبر و تشدد سے وہ تو صرف اہل حکومت ہی کر سکتے ہیں دوسری صورت اعتقاد و اعتماد کی وجہ سے حکم ماننے کی ہے، وہ حضرات فقہاء ہی کو حاصل ہے جس کا مشاہدہ عام مسلمانوں کے حالات سے ہر دور میں ہوتا رہا ہے کہ دین کے معاملات میں ام مسلمان اپنے اختیار سے علماء ہی کے حکم کو واجب العمل قرار دیتے ہیں اور از روئے شروع ان پر ان کے احکام کی اطاعت واجب بھی ہے، لہٰذا اس وجہ سے ان پر بھی اولی الامر کا اطلاق صحیح ہے (احکام القرآن للجصاص)

اس بحث کی مزید تفصیل آیت اطیعواللہ واطیعوالرسول واولی الامر منکم کے تحت بھی گذر چکی ہے۔

<u>مسائل جدیدہ میں قیاس واجتہاد عوام کے لیے تقلید ائمہ کا ثبوت ہے :۔</u>

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جن مسائل میں کوئی نصف نہ ہو ان کے احکام اجتہاد قیاس کے اصول پر قرآنی حیثیت سے نکالے جائیں، کیونکہ اس آیت میں اس بات کا حکم دیا گیا کہ مسائل جدیدہ کے حل میں اگر رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) موجود ہیں تو ان کی جانب رجوع کرو، اور اگر وہ موجود نہ ہوں تو علماء اور فقہاء کی طرف رجوع کرو، کیونکہ وہ احکام کو مستنبط کرنے کی صلاحیت تام رکھتے ہیں۔

<u>اس بیان سے چند امور مستفاد ہوئے ہیں:</u>

ایک یہ کہ فقہاء اور علماء کی جانب عدم نص کی صورت میں رجوع کیا جائے گا۔

<u>دوسرے یہ کہ احکام اللہ کی دو قسمیں ہیں:</u>

بعض وہ ہیں جو منصوص اور صریح ہیں اور بعض وہ ہیں جو غیر صریح اور مبہم ہیں جن کو آیات کی گہرائیوں میں اللہ تعالیٰ نے ودیعت کر رکھا ہے۔

تیسرے یہ کہ علماء کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ایسے معانی کو اجتہاد اور قیاس کے ذریعے استنباط کریں۔

چھٹے یہ کہ عوام کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان مسائل میں علماء کی تقلید کریں۔

رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی استنباط واستدلال کے مکلّف تھے :۔ لعلمہ الذین یستنبطونہ منھم، اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی دلائل کے ذریعہ احکام کے استنباط کے مکلّف تھے، اس لیے کہ پہلی آیت میں دو آدمیوں کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا، ایک رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف اور دوسرے اولوالامر کی طرف، اس کے بعد فرمایا لعلمہ الذین

یستنبطونہ اور یہ حکم عام ہے، جس میں مذکورہ فریقین میں سے کسی کی تخصیص نہیں ہے، لہٰذا اس سے ثابت ہوا کہ آپ کی ذات بھی استنباط احکام کی مکلّف تھی۔ (احکام القرآن للحضاص)

فوائدِ مہمہ :۔ اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ اس آیت سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ دشمن سے امن اور خوف کے بارے میں تم خود بخود خبریں نہ اڑاؤ، بلکہ جو اہل علم اور ذی رائے ہیں ان کی طرف رجوع کرو، پھر وہ غور و فکر کر کے جو بات بتلائیں اس پر عمل کرو، ظاہر ہے کہ مسائل حوادث سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

تو جواب یہ ہے کہ آیت واذا جآء ھم امر من الامن اوالخوف میں دشمن کا کوئی ذکر نہیں ہے، لہٰذا امن اور خوف عام ہے، جس طرح ان کا تعلق دشمن سے ہے، اسی طرح مسائل حوادث سے بھی ہے، کیونکہ جب کوئی جدید مسئلہ عامی کے سامنے آتا ہے جس کی حلت اور حرمت کے بارے میں کوئی نص نہیں ہے، تو وہ فکر میں پڑ جاتا ہے کہ کونسا پہلو اختیار کرے اور دونوں صورتوں میں نفع، نقصان کا احتمال رہتا ہے تو اس کا بہترین حل شریعت نے یہ نکالا کہ تم اہل استنباط کی طرف رجوع کرو، وہ جو بات بتلائیں اس پر عمل کرو۔ (احکام القرآن للجصاص ملخصاً)

اجتہاد و استنباط غلبہ ظن کا فائدہ دیتا ہے علم یقینی کا نہیں :۔ ۲۔ استنباط سے جو حکم فقہاء نکالیں گے اس کے بارے میں قطعی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اللہ کے نزدیک قطعی طور پر یہی حق ہے، بلکہ اس حکم کے خطاء ہونے کا بھی احتمال باقی رہتا ہے، ہاں اس کے صحیح ہونے کا ظن غالب حاصل ہو جاتا ہے، جو عمل کے لیے کافی ہے۔ (احکام القرآن للجصاص و تفسیر کبیری)

84 فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ○

خلاصہ تفسیر

(جب جہاد کی ضرورت معلوم ہوئی) پس آپ (اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کی راہ میں (کفار سے) قتال کیجئے (اور اگر فرضاً کوئی آپ کے ساتھ نہ ہو تو کچھ فکر نہ کیجئے کیونکہ) آپ کو بجز آپ کے ذاتی فعل کے (دوسرے شخص کے فعل کا) کوئی حکم نہیں اور (اس کے ساتھ) مسلمانوں کو (صرف) ترغیب دیدیجئے (پھر اگر کوئی ساتھ نہ دے تو آپ بری الذمہ ہیں نہ تو باز پرس کی فکر کیجئے جس کی وجہ مذکور ہو چکی اور نہ تنہا رہ جانے کا غم کیجئے جس کی وجہ یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ سے امید ہے (اور یہ امید دلانا وعدہ ہے) کہ کافروں کے زور جنگ کو روک دیں گے (اور

ان کو مغلوب کردیں گے) اور (گو یہ بڑے زور دار نظر آتے ہیں لیکن) اللہ تعالیٰ اور جنگ میں (ان سے بمراح بے شمار) زیادہ شدید (اور قوی) ہیں اور (مخالف کو) سخت سزا دیتے ہیں۔

<u>معارف و مسائل</u>

<u>شان نزول :۔</u> جب غزوہ احد شوال میں ہو چکا تو رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ذیقعدہ میں کفار کے وعدہ کے موافق بدر میں مقابلہ کے لیے جانا چاہا (جس کو مورخین بدر صغری کے نام سے تعبیر کرتے ہیں) اس وقت بعض لوگوں نے تازہ زخمی ہونے کی وجہ سے اور بعض نے افواہیں خبروں کی وجہ سے جانے میں کچھ تامل کیا، تو اللہ پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، جس میں رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ ہدایت کی گئی کہ اگر یہ کچے مسلمان لڑائی سے ڈرتے ہیں تو اسے رسول تم تنہا اپنی ذات سے جہاد کرنے میں توقف مت کرو اللہ تعالیٰ تمہارا امدادگار ہے، اس ہدایت کو پاتے ہی آپ ستر ہمراہیوں کے ساتھ بدر صغری کو تشریف لے گئے، جس کا وعدہ ابوسفیان کے ساتھ غزوہ احد کے بعد ہوا تھا، حق تعالیٰ نے ابوسفیان اور کفار قریش کے دل میں رعب اور خوف ڈال دیا اور کوئی مقابلہ میں نہ آیا اور وہ اپنے وعدے سے جھوٹے ہوئے، اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد کے موافق کافروں کی لڑائی کو بند کر دیا اور رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے ساتھیوں سمیت سلامتی کے ساتھ واپس تشریف لے آئے۔ (قرطبیؒ، مظہری)

<u>قرآنی احکام کا حسن اسلوب :۔</u>

فقاتل فی سبیل اللہ الخ اس آیت کے پہلے جملہ میں تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ حکم دیا گیا ہے کہا آپ تن تنہا جہاد و قتال کے لیے تیار ہو جایئے، کوئی دوسرا آپ کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو یا نہ ہو، مگر ساتھ ہی دوسرے جملہ میں یہ بھی ارشاد فرمادیا کہ دوسرے مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دینے کا کام بھی چھوڑیں نہیں، ترغیب کے بعد بھی وہ تیار نہ ہوں تو آپ اپنا فرض ادا کر چکے، ان کے فعل کی آپ سے بازپرس نہ ہو گی۔

اسی کے ساتھ تن تنہا جنگ کرنے میں جو خطرہ ہو سکتا تھا اس کے ازالہ کے لیے فرمایا کہ اس کی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں کی جنگ کو روک دے اور ان کو مرعوب و مغلوب کر دے اور آپ کو تنہا ہی کامیاب کر دے، پھر اس کے بعد اس کامیاب ہونے پر دلیل بیان فرمائی کہ جب اللہ تعالیٰ کی مدد آپ کے ساتھ ہے جس کی قوت جنگ اور زور جنگ ان کافروں سے بدرجہا زیادہ ہے تو پھر کامیابی بھی یقیناً آپ ہی کی ہے، پھر اسی شدت باس کے ساتھ اپنی سزا کی شدت بھی بیان فرمائی، یہ سزا خواہ قیامت میں ہو جیسا کہ ظاہر ہے، یا دنیا میں ہو جیسا کہ بعض نے کہا، بہر حال جس طرح جنگ کرنے میں ہماری قوت و طاقت بڑھی ہوئی ہے اسی طرح سزا دینے میں بھی ہماری سزا بہت سخت ہے۔

85: مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ○

خلاصہ تفسیر

جو شخص اچھی سفارش کرے (یعنی جس کا طریق مقصود دونوں مشروع ہوں) اس کی اس (سفارش) کی وجہ سے (ثواب کا) حصہ ملے گا اور جو شخص بری سفارش کرے (یعنی جس کا طریق و غرض غیر مشروع ہو) اس کو اس (سفارش) کی وجہ سے (گناہ کا) حصہ ملے گا، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والے ہیں (وہ اپنی قدرت سے نیکی پر ثواب اور بدی پر عذاب دے سکتے ہیں) اور جب تم کو کوئی (مشروع طور پر) سلام کرے تو تم اس (سلام) سے اچھے الفاظ میں سلام کرو، (یعنی جواب دو) یا (جواب میں) ایسے ہی الفاظ کہہ دو (تم کو دونوں اختیار دیئے جاتے ہیں) بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر (یعنی ہر عمل پر حساب لیں گے (یعنی ان کا قانون یہی ہے اور یوں اپنے فضل سے معاف کر دیں وہ اور بات ہے) اللہ ایسے ہیں کہ ان کے سوا کوئی معبود ہونے کے قابل نہیں، وہ ضرور تم سب کو جمع کریں گے قیامت کے دن، اس میں کوئی شبہ نہیں اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ کس کی (بات سچی ہوگی (جب وہ خبر دے رہے ہیں تو بالکل ٹھیک ہی ہے۔

معارف مسائل

سفارش کی حقیقت اس کے احکام اور اقسام :۔

من یشفع شفاعۃ حسنۃ الخ اس آیت میں شفاعت یعنی سفارش کو اچھی اور بری دو قسموں میں تقسیم فرما کر اس کی حقیقت کو بھی واضح کر دیا اور یہ بھی بتلا دیا کہ نہ ہر سفارش بری ہے اور نہ ہر سفارش اچھی، ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا کہ اچھی سفارش کرنے والے کو ثواب کا حصہ ملے گا اور بری سفارش کرنیوالے کو عذاب کا، آیت میں اچھی سفارش کے ساتھ نصیب کا لفظ آیا ہے، اور بری سفارش کے ساتھ کفل کا اور لغت میں دونوں کے معنی ایک ہی ہیں یعنی کسی چیز کا ایک حصہ لیکن عرف عام میں لفظ نصیب اچھے حصہ کے لیے بولا جاتا ہے اور لفظ کفل اکثر برے حصہ کے لیے استعمال کرتے ہیں، اگرچہ کہیں کہیں اچھے حصہ کے لیے بھی لفظ کفل استعمال ہوا ہے، جیسے قرآن کریم میں کفلین من رحمتہ ارشاد ہے۔

شفاعت کے لفظی معنے ملنے یا ملانے کے ہیں اسی وجہ سے لفظ شفعہ عربی زبان میں جوڑے کے معنی میں آتا ہے اور اس کے بالمقابل لفظ وتر بمعنے طاق استعمال کیا جاتا ہے اس لیے شفاعت کے لفظی معنی یہ ہوئے کہ کسی کمزور طالب حق کے ساتھ اپنی قوت ملا کر اس کو قوی کر دیا جائے، یا بیکس اکیلے شخص کے ساتھ خود مل کر اس کو جوڑا بنا دیا جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جائز شفاعت سفارش کے لیے ایک تو یہ شرط ہے کہ جس کی سفارش کی جائے اس کا مطالبہ حق اور جائز ہو، دوسرے یہ کہ وہ اپنے مطالبہ کو بوجہ کمزوری خود بڑے لوگوں تک نہیں پہنچا سکتا، آپ پہنچادیں، اس سے معلوم ہوا کہ خلاف حق سفارش کرنا یا دوسروں کو اس کے قبول پر مجبور کرنا شفاعت سیہ یعنی بری سفارش ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ سفارش میں اپنے تعلق یا وجاہت سے طریقہ دباؤ اور اجبار کا استعمال کیا جائے تو وہ بھی ظلم ہونے کی وجہ سے جائز نہیں، اسلیئے وہ بھی شفاعت سیہ میں داخل ہے۔

اب خلاصہ مضمون آیت مذکورہ کا یہ ہو گیا کہ جو شخص کسی شخص کے جائز حق اور جائز کام کے لیے جائز طریقہ پر سفارش کرے تو اس کو ثواب کا حصہ ملے گا اور اسی طرح جو کسی ناجائز کام کے لیے یا ناجائز طریقہ پر سفارش کرے گا اس کو عذاب کا حصہ ملے گا۔

حصہ ملنے کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص سے سفارش کی گئی ہے وہ جب اس مظلوم یا محروم کا کام کر دے تو جس طرح اس کام کرنے والے افسر کو ثواب ملے گا، اسی طرح سفارش کرنے والے کو بھی ثواب ملے گا۔

اسی طرح کسی ناجائز کام کی سفارش کرنے والا بھی گناہ گار ہو گا اور یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ سفارش کرنے والے کا ثواب یا عذاب اس پر موقوف نہیں کہ اس کی سفارش موثر اور کامیاب بھی ہو بلکہ اس کو بہر حال اپنا حصہ ملے گا۔

رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے الدال علی الخیر کفاعلہ (رواہ البزار عن ابن مسعود والطبرانی عنہ وعن سہل بن سعد بحوالہ " مظہری) "یعنی جو شخص کسی نیکی پر کسی کو آمادہ کر دے اس کو بھی ایسا ہی ثواب ملتا ہے جیسا اس نیک عمل کرنے والے کو

اسی طرح ابن ماجہ کی ایک حدیث میں حضرت ابوہریرہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔

یعنی جس شخص نے کسی مسلمان کے قتل میں ایک کلمہ سے بھی مدد کی تو وہ قیامت میں حق تعالیٰ کی پیشی میں اس طرح لایا جائے گا کہ اس کی " " پیشانی پر یہ لکھا ہو گا کہ یہ شخص اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم و مایوس ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح نیکی پر کسی کو آمادہ کرنا نیک عمل اور برابر کا ثواب رکھتا ہے اسی طرح بدی اور گناہ پر کسی کو آمادہ کرنا یا سہارا دینا بھی برابر کا گناہ ہے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا: وکان اللہ علی کلی شی مقیتا لفظ "مقیت" کے معنی لغت کے اعتبار سے قادر مقتدر کے بھی ہیں اور حاضر و نگراں کے بھی اور روزی تقسیم کرنے والے کے بھی اور اس جملہ میں تینوں معنی مراد ہو سکتے ہیں، پہلے معنی کے اعتبار سے تو مطلب یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، عمل کرنے والے اور سفارش کرنیوالے کی جزاء یا سزا اس کے لیے دشوار نہیں۔

اور دوسرے معنی کے اعتبار سے مطلب یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر نگران و حاضر ہے اس کو سب معلوم ہے کہ کون کس نیت سے سفارش کر رہا ہے، محض بوجہ اللہ کسی بھائی کی امداد کرنا مقصود ہے یا کوئی اپنی غرض بطور رشوت کے اس سے حاصل کرنا ہے۔

اور تیسرے معنی کے اعتبار سے مطلب یہ ہو گا کہ رزق و روزی کی تقسیم کا تو اللہ تعالیٰ طور متکفل ہے، جتنا کسی کے لیے لکھ دیا ہے وہ اس کو مل کر رہے گا کسی کی سفارش کرنے سے وہ مجبور نہیں ہو جائے گا بلکہ جس کو جتنی چاہے روزی عطا فرمائے گا، البتہ سفارش کرنے والے کو مفت میں ثواب مل جاتا ہے کہ وہ ایک کمزور کی اعانت ہے۔

حدیث میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے:

" یعنی اللہ تعالیٰ اس وقت تک اپنے بندہ کی امداد میں لگا رہتا ہے جب تک وہ اپنے کسی مسلمان بھائی کی امداد میں لگا رہے۔ "

اسی بناء پر صحیح بخاری کی ایک حدیث میں رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے:

" یعنی تم سفارش کیا کرو تمہیں ثواب ملے گا، پھر اللہ تعالیٰ اپنے نبی کے ذریعہ جو فیصلہ فرمائیں اس پر راضی رہو۔ '

اس حدیث میں جہاں سفارش کا موجب ثواب ہونا بیان فرمایا ہے وہیں یہ بھی بتلایا کہ سفارش کی حد یہی ہے کہ کمزور آدمی جو خود اپنی بات کسی بڑے تک پہنچانے اور اپنی حاجت صحیح طور پر بیان کرنے پر قادر نہ ہو تم اس کی بات وہاں تک پہنچا دو، آگے وہ سفارش مانی جائے یا نہ مانی جائے اور اس شخص کا مطلوبہ کام پورا ہو یا نہ ہو، اس میں آپ کا کوئی دخل نہ ہونا چاہیے اور اس کے خلاف ہونے کی صورت میں آپ پر کوئی ناگواری نہ ہونی چاہیے، حدیث کے آخری جملہ میں ویقضی اللہ علی لسان نبیہ ماشاء کا یہی مطلب ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ میں اس طرف اشارہ موجود ہے کہ سفارش کا ثواب یا عذاب اس پر موقوف نہیں کہ وہ سفارش کامیاب ہو، بلکہ اس ثواب و عذاب کا تعلق مطلق سفارش کر دینے سے ہے، آپ نے شفاعت حسنہ کر دی تو ثواب کے مستحق ہو گئے اور شفاعت سیسہ کر دی تو عذاب کے مستوجب بن گئے، خواہ آپ کی سفارش پر عمل ہو یا نہ ہو۔

تفسیر بحر محیط اور بیان القرآن وغیرہ میں من یشفع میں لفظ منہا کو سببیہ قرار دے کر اس کی طرف اشارہ بتلایا ہے اور تفسیر مظہری میں امام تفسیر مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ سفارش کرنے والے کو سفارش کا ثواب ملے گا، اگرچہ اس کی سفارش قبول نہ کی گئی ہو، اور یہ بات صرف رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ مخصوص نہیں، کسی دوسرے انسان کے پاس جو سفارش کی جائے، اس کا بھی یہی اصول ہونا چاہیے کہ سفارش کر کے آدمی فارغ ہو جائے اس کے قبول کرنے پر مجبور نہ کرے، جیسا کہ خود رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت عائشہ

صدیقہ کی آزاد کردہ کنیز سے یہ سفارش فرمائی کہ اس نے جو اپنے شوہر مغیث سے طلاق حاصل کرلی اور وہ اس کی محبت میں پریشان پھرتے ہیں دوبارہ انہی سے نکاح کرلے۔

بریرہ (رض) نے عرض کیا، یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگر یہ آپ کا حکم ہے تو سر آنکھوں پر اور اگر سفارش ہے تو میری طبیعت اس پر بالکل آمادہ نہیں، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ حکم نہیں سفارش ہی ہے۔ بریرہ جانتی تھیں کہ رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خلاف اصول کوئی ناگواری نہ ہوگی، اس لیے صاف عرض کردیا کہ تو پھر میں یہ سفارش قبول نہیں کرتی، آپ نے خوش دلی کے ساتھ ان کو ان کے حال پر رہنے دیا۔

یہ تھی حقیقت سفارش کی جو شرعاً باعث اجر وثواب تھی، آج کل لوگوں نے جو اس کا حلیہ بگاڑا ہے وہ درحقیقت سفارش نہیں ہوتی، بلکہ تعلقات یا وجاہت کا اثر اور دباؤ ڈالنا ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اگر ان کی سفارش نہ مانی جائے تو ناراض ہوتے ہیں بلکہ دشمنی پر آمادہ ہوجاتے ہیں حالانکہ کسی ایسے شخص پر ایسا دباؤ ڈالنا کہ وہ ضمیر اور مرضی کے خلاف کرنے پر مجبور ہوجائے اکراہ واجبار میں داخل اور سخت گناہ ہے اور ایسا ہی ہے جیسے کوئی کسی کے مال یا کسی کے حق پر زبردستی قبضہ کرلے، وہ شخص شرعاً اور قانوناً آزاد خود مختار تھا، آپ نے اس کو مجبور کرکے اس کی آزادی سلب کرلی اس کی مثال تو ایسی ہوگی کہ کسی محتاج کی حاجت پوری کرنے کے لیے کسی دوسرے کا مال چرا کر اس کو دے دیا جائے۔

<u>سفارش پر کچھ معاوضہ لینا رشوت ہے اور حرام ہے :۔</u>

جس سفارش پر کوئی معاوضہ لیا جائے وہ رشوت ہے، حدیث میں اس کو سخت حرام فرمایا ہے، اس میں ہر طرح کی رشوت داخل ہے، خواہ وہ مالی ہو یا یہ کہ اس کا کام کرنے کے عوض اپنا کوئی کام اس سے لیا جائے۔

تفسیر کشاف وغیرہ میں ہے کہ شفاعت حسنہ وہ ہے جس کا منشاء کسی مسلمان کے حق کو پورا کرنا ہو، یا اس کو کوئی جائز نفع پہنچانا یا مضرت اور نقصان سے بچانا ہو اور یہ سفارش کا کام بھی کسی دنیوی جوڑ توڑ کے لیے نہ ہو، بلکہ محض اللہ کے لیے کمزور کی رعایت مقصود ہو اور اس سفارش پر کوئی رشوت مالی یا جانی نہ لی جائے اور یہ سفارش کسی ناجائز کام میں بھی نہ ہو، نیز یہ سفارش کسی ایسے ثابت شدہ جرم کی معافی کے لیے نہ ہو جن کی سزا قرآن میں معین ومقرر ہے۔

تفسیر بحر محیط اور مظہری میں ہے کہ کسی مسلمان کی حاجت روائی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا بھی شفاعت حسنہ میں داخل ہے اور دعا کرنے والے کو بھی اجر ملتا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ جب کوئی شخص اپنے بھائی مسلمان کے لیے کوئی دعاء خیر کرتا ہے، فرشتہ کہتا ہے "ولک بمثل" یعنی اللہ تعالیٰ تیری بھی حاجت پوری فرمائیں۔

86: وَإِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَسِيبًا ○

سلام اور اسلام

واذا حییتم بتحیۃ فحیوا باحسن منھا الخ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے سلام اور اس کے جواب کے آداب بتلائے ہیں:

لفظ تحیہ کی تشریح اور اس کا تاریخی پہلو:۔

تحیہ کے لفظی معنی ہیں کسی کو "حیاک اللہ" کہنا، یعنی "اللہ تم کو زندہ رکھے قبل از اسلام عرب کی عادت تھی کہ جب آپس میں ملتے تو ایک دوسرے کو "حیاک اللہ" یا انعم اللہ بک عینا یا "انعم صباحاً وغیرہ الفاظ سے سلام کیا کرتے تھے، اسلام نے اس طرز تحیہ کو بدل کر السلام علیکم کہنے کا " طریقہ جاری کیا، جس کے معنی ہیں "تم ہر تکلیف اور رنج و مصیبت سے سلامت رہو۔

ابن عربی نے احکام القرآن میں فرمایا کہ لفظ سلام اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنی میں سے ہے اور "السلام علیم" کے معنی یہ ہیں کہ "اللہ رقیب علیم" "یعنی " اللہ تعالیٰ تمہارا محافظ ہے۔

اسلامی سلام تمام دوسری اقوام کے سلام سے بہتر ہے:۔ دنیا کی ہر مہذب قوم میں اس کا رواج ہے کہ جب آپس میں ملاقات کریں تو کوئی کلمہ آپس کی موانست اور اظہار محبت کے لیے کہیں، لیکن موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلامی سلام جتنا جامع ہے کوئی دوسرا ایسا جامع نہیں، کیونکہ اس میں صرف اظہار محبت ہی نہیں، بلکہ ساتھ ساتھ ادائے حق محبت بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ آپ کو تمام آفات اور آلام سے سلامت رکھیں، پھر دعاء بھی عرب کے طرز پر صرف زندہ رہنے کی نہیں، بلکہ حیات طیبہ کی دعاء ہے، یعنی تمام آفات اور آلام سے محفوظ رہن کی، اسی کے ساتھ اس کا بھی اظہار ہے کہ ہم اور تم سب اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں، ایک دوسرے کو کوئی نفع بغیر اس کے اذن کے نہیں پہنچا سکتا، اس معنی کے اعتبار سے یہ کلمہ ایک عبادت بھی ہے اور اپنے بھائی مسلمان کو اللہ تعالیٰ کی یاد دلانے کا ذریعہ بھی۔

اسی کے ساتھ اگر یہ دیکھا جائے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگ رہا ہے کہ ہمارے ساتھی کو تمام آفات اور تکالیف سے محفوظ فرمادے تو اس کے ضمن میں وہ گیا یہ وعدہ بھی کر رہا ہے کہ تم میرے ہاتھ اور زبان سے مامون ہو، تمہاری جان، مال، آبرو کا میں محافظ ہوں۔

" یعنی تم جانتے ہو کہ سلام کیا چیز ہے؟ سلام کرنے والا یہ کہتا ہے کہ تم مجھ سے مامون رہو "

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام تحیہ ایک عالمگیر جامعیت رکھتا ہے: (۱) اس میں اللہ تعالیٰ کا بھی ذکر ہے (۲) تذکیر بھی (۳) اپنے بھائی مسلمان سے اظہار تعلق و محبت بھی (۴) اس کے لیے بہترین دعا بھی (۵) اور اس سے یہ معاہدہ بھی کہ میرے ہاتھ اور زبان سے آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچے گی، جیسا کہ حدیث صحیح میں رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ ارشاد ہے:

" یعنی مسلمان تو وہی ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے سب مسلمان محفوظ رہیں، کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ "

کاش مسلمان اس کلمہ کو عام لوگوں کی رسم کی طرح اداء نہ کرے، بلکہ اس کی حقیقت کو سمجھ کر اختیار کرے، تو شاید پوری قوم کی اصلاح کے لیے یہی کافی ہو جائے، یہی وجہ ہے کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مسلمانوں کے باہم سلام کو رواج دینے کی بڑی تاکید فرمائی اور اس کو افضل الاعمال قرار دیا اور اس کے فضائل و برکات اور اجر و ثواب بیان فرمائے، صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ کی ایک حدیث ہے کہ رسول کریم **(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ:**

" تم جنت میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتے جب تک مومن نہ ہو اور تمہارا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا جب تک آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ کرو، میں تم کو ایسی چیز بتاتا ہوں کہ اگر تم اس پر عمل کر لو تو تمہاری آپس میں محبت قائم ہو جائے گی، وہ یہ کہ آپس میں سلام کو عام کرو، " یعنی ہر مسلمان کے لیے خواہ اس سے جان پہچان ہو یا نہ ہو۔

حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے دریافت کیا کہ اسلام کے اعمال میں سب سے افضل کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ تم لوگوں کو کھانا کھلا دو اور سلام کو عام کرو خواہ تم اس کو پہچانتے ہو یا نہ پہنچانتے ہو (صحیحین)

مسند احمد، ترمذی، ابوداؤد نے حضرت ابوامامہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ قریب وہ شخص ہے جو سلام کرنے میں ابتداء کرے۔

مسند بزار اور معجم کبیر طبرانی میں حضرت عبداللہ بن مسعود کی حدیث ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ سلام اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر اتارا ہے، اس لیے تم آپس میں سلام کو عام کرو، کیونکہ مسلمان آدمی جب کسی مجلس میں جاتا ہے اور ان کو سلام کرتا ہے تو اس شخص کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک فضیلت کا ایک بلند مقام حاصل ہوتا ہے، کیونکہ اس نے سب کو سلام، یعنی اللہ تعالیٰ کی یاد دلائی، اگر مجلس والوں نے اس کے سلام کا جواب نہ دیا تو ایسے لوگ اس کو جواب دیں گے جو اس مجلس والوں سے بہتر ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے فرشتے

اور ایک حدیث میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے کہ بڑا بخیل وہ آدمی ہے جو سلام میں بخل کرے (طبرانی، معجم کبیر عن ابی ہریرہ)

رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ان ارشادات کا صحابہ کرام پر جو اثر ہوا اس کا اندازہ اس روایت سے ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر اکثر بازار میں صرف اس لیے جایا کرتے تھے کہ جو مسلمان ملے اس کو سلام کر کے عبادت کا ثواب حاصل کریں، کچھ خریدنا یا فروخت کرنا مقصود نہ ہوتا تھا، یہ روایت موطا امام مالک میں طفیل بن ابی بن کعب (رض) سے نقل کی ہے۔

قرآن مجید کی جو آیت اوپر ذکر کی گئی ہے اس میں ارشاد یہ ہے کہ جب تمہیں سلام کیا جائے تو اس کا جواب اس سے بہتر الفاظ میں دو، یا کم از کم ویسے ہی الفاظ کہہ دو اس کی تشریح رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے عمل سے اس طرح فرمائی کہ ایک مرتبہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس ایک صاحب آئے اور کہا "السلام علیک یارسول اللہ" آپ نے جواب میں ایک کلمہ بڑھا کر فرمایا: "وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ۔" پھر ایک صاحب آئے اور انھوں نے سلام میں یہ الفاظ کہے: "السلام علیک یارسول اللہ ورحمتہ اللہ۔" آپ نے جواب میں ایک اور کلمہ بڑھا کر فرمایا "وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔" پھر ایک صاحب آئے انھوں نے اپنے سلام ہی میں تینوں کلمے بڑھا کر کہا "السلام علیک یارسول اللہ ورحمتہ اللہ وبرکاتہ" آپ نے جواب میں صرف ایک کلمہ "وعلیک" ارشاد فرمایا، ان کے دل میں شکایت پیدا ہوئی اور عرض کیا یارسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان پہلے جو حضرات آئے آپ نے ان کے جواب میں کئی کلمات دعاء کے ارشاد فرمائے اور میں نے ان سب الفاظ سے سلام کیا تو آپ نے "وعلیک" پر اکتفا فرمایا آپ نے فرمایا کہ تم نے ہمارے لیے کوئی کلمہ چھوڑا ہی نہیں کہ ہم جواب میں اضافہ کرتے، تم نے سارے کلمات اپنے سلام ہی میں جمع کر دیئے، اس لیے ہم نے قرآنی تعلیم کے مطابق تمہارے سلام کا جواب بالمثل دینے پر اکتفا کر لیا اس روایت کو ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے مختلف اسانید کے ساتھ نقل کیا ہے۔

حدیث مذکور سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ سلام کا جواب اس سے اچھے الفاظ میں دینے کا جو حکم آیت مذکورہ میں آیا ہے اس کی صورت یہ ہے کہ سلام کرنے والے کے الفاظ سے بڑھا کر جواب دیا جائے، مثلاً اس نے کہا: "السلام علیکم" تو آپ جواب دیں "وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ۔" اور "اس نے کہا" السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔" تو آپ جواب میں کہیں "وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ یہ کلمات کی زیادتی صرف تین کمالات تک مسنون ہے اس سے زیادہ کرنا مسنون نہیں اور حکمت اس کی ظاہر ہے کہ سلام کا موقع مختصر کلام کرنے کا مقتضی ہے، اس میں اتنی زیادتی مناسب نہیں ہے، جو کسی کام میں مخل یا سننے والے پر بھاری ہو جائے اسی لیے جب ایک صاحب نے اپنے ابتدائی سلام ہی میں تینوں کلمے جمع کر دیئے تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے آگے اور زیادتی سے احتراز فرمایا، اس کی مزید توضیح حضرت عبداللہ بن عباس نے اس طرح فرمائی کہ مذکورہ تینوں سے زیادہ کرنے والے کو یہ کہہ کر روک دیا کہ: ان السلام قد انتھی الی البرکتہ (مظہری عن البغوی) یعنی "سلام لفظ برکت پر ختم ہو جاتا ہے۔" اس سے زیادہ کرنا مسنون نہیں ہے۔ (ومثلہ عن ابن کثیر)

تیسری بات حدیث مذکور سے یہ معلوم ہوئی کہ سلام میں تین کلمے کہنے والے کے جواب میں اگر صرف ایک کلمہ ہی کہہ دیا جائے تو وہ بھی اداء بالمثل کے حکم میں حکم قرآنی (اور دعا) کی تعمیل کے لیے کافی ہے، جیسا کہ اس حدیث میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صرف ایک کلمہ پر اکتفا فرمایا ہے۔ (تفسیر مظہری)

مضمون آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ جب کسی مسلمان کو سلام کیا جائے تو اس کے ذمہ جواب دینا تو واجب ہے، اگر بغیر کسی عذر شرعی کے جواب نہ دیا تو گناہ گار ہوگا، البتہ جواب دینے میں دو باتوں کا اختیار ہے، ایک یہ کہ جن الفاظ سے سلام کیا گیا ہے ان سے بہتر الفاظ میں جواب دیا جائے، دوسرے یہ کہ بعینہ انہی الفاظ سے جواب دے دیا جائے۔

اس آیت میں سلام کا جواب دینے کو تو لازم جواب صراحۃ بتلا دیا گیا ہے، لیکن ابتداءً سلام کرنے کا کیا درجہ ہے، اس کا بیان صراحتاً نہیں ہے۔ مگر اذا حییتم میں اس کے حکم کی طرف بھی اشارہ موجود ہے، کیونکہ اس لفظ کو بصیغہ مجہول بغیر تعیین فاعل ذکر کرنے میں اشارہ ہو سکتا ہے کہ سلام ایسی چیز ہے جو عادۃ سب ہی مسلمان کرتے ہیں۔

مسند احمد، ترمذی، ابوداؤد میں رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد منقول ہے کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مقرب وہ شخص ہے جو سلام کی ابتداء کرے۔

اور سلام کی تاکید اور فضائل آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ارشادات سے ابھی آپ سن چکے ہیں ان سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء سلام کرنا بھی سنت موکدہ سے کم نہیں تفسیر بحر محیط میں ہے کہ ابتدائی سلام تو اکثر علماء کے نزدیک سنت موکدہ ہے اور حضرت حسن بصری نے فرمایا "السلام تطوع والرد فریضۃ یعنی" ابتداء سلام کرنے میں تو اختیار ہے لیکن سلام کا جواب دینا فرض ہے۔

رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس حکم قرآنی کی مزید تشریح کے طور پر سلام اور جواب سلام کے متعلق اور بھی کچھ تفصیلات بیان فرمائی ہیں وہ بھی مختصر طور پر ملاحظہ کر لیجئے صحیحین کی حدیث میں ہے کہ جو شخص سواری پر ہو اس کو چاہیے کہ پیادہ چلنے والے کو خود سلام کرے اور جو چل رہا ہو وہ بیٹھے ہوئے کو سلام کرے اور جو لوگ تعداد میں قلیل ہوں وہ کسی بڑی جماعت پر گذریں تو ان کو چاہیے کہ سلام کی ابتداء کریں۔

ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ جب آدمی اپنے گھر میں جائے تو اپنے گھر والوں کو سلام کرنا چاہیے کہ اس سے اس کے لیے بھی برکت ہو گیا اور اس کے گھر والوں کے لیے بھی۔

ابو داؤد کی ایک حدیث میں ہے کہ ایک مسلمان سے بار بار ملاقات ہو تو ہر مرتبہ سلام کرنا چاہیے اور جس طرح اول ملاقات کے وقت سلام کرنا مسنون ہے اسی طرح رخصت کے وقت بھی سلام کرنا مسنون اور ثواب ہے، ترمذی، ابو داؤد میں یہ حکم بروایت قتادہ وابوہریرہ (رض) نقل کیا ہے۔

اور یہ حکم جوا بھی بیان کیا گیا ہے کہ سلام کا جواب دینا واجب ہے، اس سے چند حالات مستثنی ہیں، جو شخص نماز پڑھ رہا ہے اگر کوئی اس کو سلام کرے تو جواب دینا واجب نہیں بلکہ مفسد نماز ہے، اسی طرح جو شخص خطبہ دے رہا ہے یا قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول ہے، یا اذان یا اقامت کہہ رہا ہے، یا دینی کتابوں کا درس دے رہا ہے۔ یا انسانی ضروریات استنجاو غیرہ میں مشغول ہے اس کو اس حالت میں سلام کرنا بھی جائز نہیں اور اس کے ذمہ جواب دینا بھی واجب نہیں۔

اختتام مضمون پر فرمایا: ان اللہ کان علی کل شیء حسیباً یعنی "اللہ تعالیٰ ہر چیز کا حساب لینے والے ہیں۔" جن میں انسان اور اسلامی حقوق مثل سلام اور جواب سلام کے سب امور داخل ہیں، ان کا بھی اللہ تعالیٰ حساب لیں گے۔

87: اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ۝

پھر فرمایا اللہ لا الہ الا ھو لیجمعنکم الی یوم القیمۃ لاریب فیہ یعنی "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اسی کو معبود جانو ر جو کام کرو اس کی عبادت کی نیت سے کرو، وہ تم کو قیامت کے روز جمع فرمائیں گے، جس میں کوئی شک نہیں ہے، اس روز سب کے بدلے عنایت فرمائیں گے، قیامت کا وعدہ اور جزاء و سزا کی خبر سب حق ہے۔" ومن اصدق من اللہ حدیثاً کیونکہ اللہ کی دی ہوئی خبر ہے، اور اللہ سے بڑھ کر کس کی بات سچی ہو سکتی ہے؟

88: فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ۭ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ○

خلاصہ تفسیر

تین مختلف گروہوں کا بیان اور ان کے احکام

پہلے فرقہ کا بیان :۔ (جب تم ان مرتدین کی حالت دیکھ چکے) پھر تم کو کیا ہوا کہ ان منافقین کے باب میں تم (اختلاف رائے کر کے) دو گروہ ہو گئے (کہ ایک گروہ ان کو اب بھی مسلمان کہتا ہے) حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو (ان کے علانیہ کفر کی طرف) الٹا پھیر دیا ان کے (بد) عمل کے سبب (وہ بد عمل اور تداداً دار السلام کو باوجود قدرت کے چھوڑ دینا ہے، جو کہ اس وقت نہ ہوئے تھے اور اسی وجہ سے ان کو منافق کہا) کیا تم لوگ (اے وہ گروہ جن کو اس ترک دار الاسلام کا علامت کفر ہونا معلم نہیں) اس کا ارادہ رکھتے ہو کہ ایسے لوگوں کو ہدایت کرو جن کو اللہ تعالیٰ نے (جبکہ ان لوگوں نے گمراہی اختیار کی) گمراہی میں ڈال رکھا ہے (جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ عزم فعل کے وقت اس فعل کو پیدا کر دیتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ غیر مومن میں گمراہ کو جو ہدایت یافتہ مومن کہتے ہو یہ تمہارے لیے جائز نہیں) اور جس کو ان لوگوں کو مومن نہ کہنا چاہیے اور بھلا وہ خود کیا مومن ہوں گے ان کے غلو فی الکفر کی تو یہ حالت ہے کہ) وہ اس تمنا میں ہیں کہ جیسے وہ کافر ہیں تم بھی (خدا نہ کرے) کافر بن جاؤ، جس میں تم اور وہ سب ایک طرح ہو جاؤ سو (ان کی جب یہ حالت ہے تو) ان میں سے کسی کو دوست مت بنانا (یعنی کسی کے ساتھ مسلمانوں کے ساتھ ایسا برتاؤ مت کرنا، کیونکہ دوستی کے جواز کے لیے اسلام شرط ہے) جب تک وہ اللہ کی راہ میں (یعنی تکمیل اسلام کے لیے) ہجرت نہ کریں (کیونکہ اس وقت ہجرت کا وہ حکم تھا جو اب اقرار بالشہادتین کا ہے اور تکمیل اسلام کی قید اس لیے ہے کہ خالی دار السلام میں آنا کافی نہیں، یوں تو کفار اہل تجارت بھی آ جاتے ہیں، بلکہ اسلامی حیثیت سے آویں، یعنی اسلام بھی ظاہر کریں، تاکہ جامع اقرار و ہجرت کے ہو جاویں اور رہی قلبی تصدیق تو اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہو سکتا ہے مسلمانوں کو اس کی تفتیش ضروری نہیں) اور اگر وہ (اسلام سے) اعراض کریں (اور کافر ہی رہیں) تو ان کو پکڑو اور قتل کرو جس جگہ ان کو پاؤ (یہ پکڑنا یا تو قتل کے لیے ہے یا غلام بنانے کے لئے) اور نہ ان میں کسی کو دوست بناؤ اور نہ (مددگار بناؤ (مطلب یہ کہ کسی حالت میں ان سے کوئی تعلق نہ رکھو، نہ امن میں دوستی نہ خوف میں استعانت بلکہ الگ تھلگ رہو۔

دوسرے فرقہ کا بیان :۔

مگر (ان کفار میں) جو لوگ ایسے ہیں جو کہ (تمہارے ساتھ مصالحت سے رہنا چاہتے ہیں، جس کے دو طریقے ہیں ایک تو یہ کہ بواسطہ صلح ہو یعنی) ایسے لوگوں سے جا ملتے ہیں (یعنی ہم عہد ہو جاتے ہیں) کہ تمہارے اور ان کے درمیان عہد (صلح) ہے، (جیسے بنو مدلج، کہ ان سے صلح ہوئی تو ان

کے ہم عہد بھی اس استثناء میں آگئے تو بنو مدلج بدرجہ اولی مستثنی ہوئے) یا (دوسرے طریقہ یہ ہے کہ بلاواسطہ صلح ہو اس طرح سے کہ) خود تمہارے پاس اس حال سے آویں کہ ان کا دل تمہارے ساتھ اور نیز اپنی قوم کے ساتھ بھی لڑنے سے منقبض ہو (اس لیے نہ تو اپنی قوم کے ساتھ ہو کہ تم سے لڑیں اور نہ تمہارے ساتھ ہو اپنی قوم سے لڑیں بلکہ (ان سے بھی صلح رکھیں اور تم سے بھی، پس دونوں طریقوں میں جس طریق سے کوئی مصالحت رکھے وہ حکم مذکور پکڑنے اور قتل سے مستثنی ہیں) اور (تم ان لوگوں کی) درخواست صلح میں اللہ تعالیٰ کا احسان مانو کہ ان کے دل میں تمہاری ہیبت ڈال دی ورنہ) اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کو تم پر مسلط (اور لدیر) کر دیتا پھر وہ تم سے لڑنے لگتے (مگر اللہ تعالیٰ نے تم کو اس پریشانی سے بچالیا) پھر اگر (صلح کر کے) وہ تم سے کنارہ کش رہیں یعنی تم سے نہ لڑیں اور تم سے معاملہ سلامت روی کا رکھیں (ان سب الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ صلح سے رہیں کوئی لفظ تاکید کے لیے فرمادیئے) تو (اس حالت صلح میں) اللہ تعالیٰ نے تم کو ان پر (قتل یا قید وغیرہ کی) کوئی راہ نہیں دی (یعنی اجازت نہیں دی)

تیسرے فرقہ کا بیان :۔

بعضے ایسے بھی تم کو ضرور ملیں گے (یعنی ان کی یہ حالت معلوم ہو گی) کہ (براہ دھوکہ) وہ یہ (بھی) چاہتے ہیں کہ تم سے بھی بے خطر ہو کر رہیں اور اپنی قوم سے بھی بے خطر ہو کر رہیں (اور ساتھ ہی اس کے) جب کبھی ان کو (صریح مخالفین کی طرف سے) شرارت (وفساد) کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے (یعنی ان سے مسلمانوں سے لڑنے کے لیے کہا جاتا ہے) تو وہ (فوراً) اس (شرارت) میں جا گرتے ہیں (یعنی مسلمانوں سے لڑنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور وہ دھوکہ کی صلح توڑ دیتے ہیں) سو یہ لوگ اگر (صلح توڑ دیں اور) تم سے (یعنی تمہاری لڑائی سے) کنارہ کش نہ ہوں اور نہ تم سے سلامت روی رکھیں اور نہ اپنے ہاتھوں کو (تمہارے مقابلہ سے) روکیں (سب کا مطلب مثل سابق کے ایک ہی ہے کہ صلح توڑ دیں) تو تم (بھی) ان کو پکڑو اور قتل کرو جہاں کہیں ان کو پاؤ اور ہم نے تم کو ان پر صاف حجت دی ہے (جس سے ان کا قتل کرنا ظاہر ہے اور وہ حجت ان کا نقص عہد ہے)

معارف و مسائل

مذکورہ آیات میں تین فرقوں کا بیان ہے، جن کے متعلق دو حکم مذکور ہیں، واقعات ان فرقوں کے مندرجہ روایات سے واضح ہوں گے۔

پہلی روایت :۔

عبد بن حمید نے مجاہد سے روایت کیا کہ بعض مشرکین مکہ سے مدینہ آئے اور ظاہر کیا کہ ہم مسلمان اور مہاجر ہو کر آئے ہی، پھر مرتد ہو گئے اور حضرت رسول مقبول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اسباب تجارت لانے کا بہانہ نہ کرے کے پھر مکہ چل دیئے اور پھر نہ آئے ان کے بارے میں

مسلمانوں کی رائے مختلف ہوئی، بعض نے کہا یہ کافر ہیں بعض نے کہا یہ مومن ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کا کافر ہونا آیت فما لکم فی المنفقین فئتین میں بیان کر دیا اور ان کے قتل کا حکم دیا۔

حضرت حکیم الامت تھانوی نے فرمایا کہ ان کا منافق کہنا بایں معنی ہے کہ جب اسلام کا دعویٰ کیا تھا جب بھی منافق تھے دل سے ایمان نہ لائے تھے اور منافقین کو قتل نہ کئے جاتے تھے لیکن جب تک ہی کہ اپنا کفر چھپاتے تھے اور ان لوگوں کا ارتداد ظاہر ہو گیا تھا اور جنہوں نے مسلمان کہا شاید حسن ظن کی وجہ سے کہا ہو، اور ان کے دلائل ارتداد میں کچھ تاویل کر لی ہوگی اور اس تاویل کی بنیاد رائے محض ہوگی جس کی تائید دلیل شرعی سے نہ ہو گیا اس لیے معتبر نہیں رکھی گئی۔

دوسری روایت :۔

ابن ابی شیبہ نے حسن سے رایت کیا کہ سراقہ بن مالک مدلجی نے بعد واقعہ بدر واحد کے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حضور میں آکر درخواست کی کہ ہماری قوم بنی مدلج سے صلح کر لیجئے، آپ نے حضر خالد کو تکمیل صلح کے لیے وہاں بھیج دیا، مضمون صلحیہ تھا:

ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خلاف کسی کی مدد نہ کریں گے اور قریش مسلمان ہو جائیں گے تو ہم بھی مسلمان ہو جائیں گے اور " " جو قومیں ہم سے متحد ہوں گی وہ بھی اس معاہدہ میں ہمارے شریک ہیں۔

اس پر یہ آیت ودوالوتکفرون الی قولہ الا الذین یصلون الخ نازل ہوئی۔

تیسری روایت :۔ حضرت ابن عباس سے روایت کیا گیا کہ آیۃ ستجدون اخرین الخ میں جن کا ذکر ہے مراد ان سے قبیلہ اسد اور غطفان ہیں کہ مدینہ میں آئے اور ظاہراً اسلام کا دعویٰ کرتے اور اپنی قوم سے کہتے کہ ہم تو بندر اور عقرب (بچھو) پر ایمان لائے ہیں اور مسلمانوں سے کہتے کہ ہم تمہارے دین پر ہیں۔

اور ضحاک نے ابن عباس سے یہی حالت بنی عبد الدار کی نقل کی ہے، پہلی اور دوسری روایت روح المعانی اور تیسری معالم میں ہے۔

حضرت تھانوی نے فرمایا کہ اس تیسری روایت والوں کی حالت مثل پہلی روایت والوں کے ہوئی، کہ دلیل سے ان کا پہلے ہی سے مسلمان نہ ہونا ثابت ہو گیا، اسی لیے ان کا حکم مثل عام کفار کے ہے، یعنی مصالحت کی حالت میں ان سے قتال نہ کیا جائے اور مصالحت نہ ہونے کی صورت میں قتال کیا جائے، چنانچہ پہلی روایت والوں کے باب میں دوسری آیت یعنی فان تولو فخذوم واقتلوھم میں گرفتار کرنے اور قتل کا حکم اور تیسری آیت الا الذین یصلون الخ میں مصالحت میں ان کا استثناء موجودہ جن کی مصالحت کا ذکر دوسری روایت میں ہے اور تاکید استثناء کے لیے پھر فان اعتزالوکم کی تصریح کر دی۔

اور تیسری روایت والوں کے باب میں چوتھی آیت یعنی ستجدون اخرین الخ میں بیان فرمادیا کہ اگر یہ لوگ تم سے کنارہ کش نہیں ہوتے بلکہ مقاتلہ کرتے ہیں تو تم ان سے جہاد کرو، اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اگروہ صلح کریں توان سے قتال نہ کیا جائے۔ (بیان القرآن)

خلاصہ یہ کہ یہاں تین فرقوں کا ذکر فرمایا گیا:

ا۔ جو ہجرت کہ شرط اسلام کے زمانہ میں باوجود قدرت کے ہجرت نہ کریں یا کرنے کے بعد دارالاسلام سے نکل کر دارالحرب میں چلے جائیں۔

۲۔ مسلمانوں سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ خود کرلیں یا ایسا معاہدہ کرنے والوں سے معاہدہ کرلیں۔

۳۔ جو دفع الوقتی کی غرض سے صلح کرلیں اور جب مسلمانوں کے خلاف جنگ کی دعوت دی جائے تو اس میں شریک ہو جائیں اور اپنے عہد پر قائم نہ رہیں۔

پہلے فریق کا حکم عام کفار کی مانند ہے، دوسرا فریق قتل اور پکڑ دھکڑ سے مستثنیٰ ہے، تیسرا فریق اسی سزا کا مستحق ہے جس کا پہلا فریق تھا، ان آیتوں کے کل دو حکم مذکور ہیں، یعنی عدم صلح کے وقت قتال اور مصالحت کے وقت قتال نہ کرنا۔

89-91: وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۠ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ۝ سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ۭ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ۭ وَاُولٰۗىِٕكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝

ہجرت کی مختلف صورتیں اور احکام:

قولہ تعالیٰ حتی یھاجروا فی سبیل اللہ الخ۔ ابتداء اسلام میں ہجرت دارالکفر سے تمام مسلمانوں پر فرض تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے ساتھ مسلمانوں کا سابرتاؤ کرنے سے منع کیا ہے جو اس فرض کے تارک ہوں، پھر جب مکہ فتح ہوا تو سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: لاھجرۃ بعد الفتح (رواہ البخاری) " یعنی جب مکہ فتح ہو کر دارالاسلام بن گیا تو اب وہاں سے ہجرت فرض نہ رہی۔" یہ اس زمانہ کا حکم ہے جبکہ ہجرت

شرط ایمان تھی اس آدمی کو مسلمان نہیں سمجھا جاتا تھا جو باوجود قدرت کے ہجرت نہ کرے، لیکن بعد میں یہ حکم منسوخ ہوگیا، اب یہ صورت باقی نہیں رہی۔

ہجرت کی دوسری صورت یہ ہے جو قیامت تک باقی رہے گی جس کے بارے میں حدیث میں آتا ہے لاتنقطع الھجرۃ حتی تنقطع التوبۃ "یعنی ہجرت اس وقت تک باقی رہے گی جب تک توبہ کی قبولیت کا وقت باقی رہے۔" (صحیح بخاری)

علامہ عینی شارح بخاری نے اس ہجرت کے متعلق لکھا ہے: ان المراد بالھجرۃ الباقیۃ ھی ھجر السئات: "یعنی اس ہجرت سے مراد گناہوں کا ترک کرنا ہے۔" جیسا کہ ایک حدیث میں رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ارشاد فرماتے ہیں المھاجر من ھجر ما نھی اللہ عنہ "یعنی مہاجر وہ ہے جو ان تمام چیزوں سے پرہیز کرے جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے۔" (بحالہ مرقاۃ جلد اول)

مذکورہ بحث سے معلوم ہوا کہ اصطلاح میں ہجرت کا اطلاق دو معنی پر ہوتا ہے (۱) دین کے لیے ترک وطن کرنا، جیسا کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اپنا وطن مکہ ترک کر کے مدینہ اور حبشہ تشریف لے گئے۔ (۲) گناہوں کا چھوڑنا۔

ولاتتخذوا منھم ولیاولانصیرا اس آیت سے معلوم ہوا کہ کفار سے طلب نصرت حرام ہے، چنانچہ ایک روایات میں آتا ہے کہ کفار کے خلاف انصار نے جب یہود سے مدد طلب کرنے کی اجازت آپ سے چاہی تو آپ نے فرمایا: الخبیث لاحاجۃ لنا بھم "یعنی یہ خبیث قوم ہے اس کی ہمیں کوئی حاجت نہیں۔" (مظہری جلد ۲)